خطباتِ اقبالؒ ۔ چند بنیادی سوالات

محمد سہیل عمر

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006
اقبال سائبر لائبریری

اس وقت اسلامی دنیا فکر و عمل کی کم و بیش ہر سطح پر ایک ہلچل اور اضطراب کی گرفت میں ہے جو اگر ایک طرف ملتِ اسلامیہ کی روحِ اجتماعی کے کروٹ لینے سے عبارت ہے تو دوسری جانب ایک نئے شعور کی طلوعِ سحر کی نوید بھی ہے۔ وہ شعور جو تاریخ کے تسلسل میں اپنے مقام کی آگہی اور عہدِ حاضر کے مسائل سے روبرو ہونے کے نتیجے میں بیدار ہو رہا ہے۔ شعور کے اس جھٹپٹے کے پس منظر میں تین بڑے فکری دھارے عالمِ اسلام کو درپیش مسائل سے نبرد آزما دکھائی دیتے ہیں جنہیں ہم سہولت کے لیے روایتی اسلام، جدیدیت اور بنیاد پرستی کے نام دیتے ہیں۔ موخر الذکر اصطلاح عیسوی الٰہیات سے مستعار ہے اور اس کا اطلاق ان تمام نظریات، تحریکات اور نظام ہائے افکار پر کیا جاتا ہے جو کسی نہ کسی رنگ میں رجوع الی الاصل اور اصلاح سے متعلق ہیں اور معاشرے کو صدرِ اسلام کے معیار تک لوٹانے کے لیے کوشاں ہیں مگر تاریخ میں ماضی کی طرف الٹی زقند لگاتے ہوئے اس فکری رویے کے نمائندوں کا عمومی رجحان یہ رہا ہے کہ وہ شجرِ اسلام کے بیخ و بن تک لوٹنے کے جوش میں اس شجرِ سایہ دار کے برگ و بار کو یا تو نظر انداز کر دیتے ہیں یا اس کی نفی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وحیِ اسلام کے بطن سے پھوٹنے والے اور صدیوں کے سفر میں نمو پانے والے یہ برگ و بار اسلامی تہذیب کے وہ مظاہر ہیں جن میں اس کے فکری، جمالیاتی اور عرفانی پہلو متشکل ہوتے ہیں اور جن سے اغماض، اعراض یا تردید کا ہر رویّہ بالآخر ایک بنجر، جمال کُش اور اتھلے نظامِ فکر و عمل پر منتج ہوتا ہے۔ بنیاد پرستی کے تحت بہت سے ایسے مکاتبِ فکر بھی آجاتے ہیں جو پوری طرح اس سے اشتراک یا اتفاق نہیں رکھتے۔ ان کو بنیاد پرستی اور جدیدیت یا بنیاد پرستی اور روایتی اسلام کے بیچ دروں بیچ بروں

ساتھی قرار دیا جا سکتا ہے۔

جدیدیت میں اسلام کی وہ تمام تعبیرات شامل ہیں جو زمانے کے تقاضوں، وقتی مصلحتوں اور ضروریات، مغرب کی نقالی، فکری شکست خوردگی، علمی مرعوبیت یا پہلے سے طے شدہ اہداف و مقاصد کے مطابق اسلام کی تفسیر کرنے سے برآمد ہوتی ہیں اور جن کو ہر مکتبِ فکر اپنی ذاتی ترجیحات اور پسند و ناپسند کا رنگ دے کر پیش کرتا ہے۔

ان کے مقابل روایتی اسلام ہے جس کی نمائندگی معاصر علمی دنیا میں گو کم رہی ہے۔ مگر درحقیقت یہی وہ رُوح ہے جس کا رس شجرِ اسلام کی جڑ سے لے کر پھننگ تک جاری و ساری ہے، جس نے زمانِ وحی سے لے کر آج تک ہر سطح پر کروڑوں نفوسِ انسانیہ کی آبیاری کی اور جو صرف ماضی کی عقلی اور جمالیاتی تحریکوں ہی میں موجود نہیں بلکہ آج بھی نبی علیہ السلام کے متبع علماء و اولیاء کی زندگیوں میں ظاہر ہے۔ قرآن کے فیضان کا ابلاغ کرنے والی سمعی و بصری ہیئتوں کے خالق فنکاروں و ہنرمندوں کے شاہکاروں میں کارفرما ہے اور عام مسلمانوں کی کثیر تعداد کے اذہان و قلوب کو اسلام کی روایتی تعلیمات کے ارتعاش سے معمور کیے ہوئے ہے۔

پیش آمدہ مسائل کا سامنا کرتے ہوئے ماضی میں ان تینوں رویّوں کا کردار تقریباً انفعالی ہی رہا ہے۔ یعنی مسائل کا تعین باہر سے ہوتا تھا اور ان مسائل سے آنکھیں چار کرنے پر مجبور ہو کر یہ مکاتبِ فکر کسی نص یا کسی قول سے رجوع کرنے کے بعد کوئی حل تلاش کرتے تھے۔ اپنے مسائل کی شناخت کرنا، اپنے مسائل کا خود تعیّن کرنا اور آگے بڑھ کر معاملات کو گرفت میں لینا بوجوہ ان کا چلن نہیں رہا۔ جدیدیت سے تو خیر اس کا شکوہ ہونا بھی نہیں چاہیے کہ وہ خود ہی انفعالیت کی پیداوار ہے اور ازروئے فطرت تشکیل و تخلیق کے لیے ضروری قوّتِ فاعلہ سے محروم ہے۔ روایتی اسلام اور بنیاد پرستی، دونوں ہی اپنی فاعلی بلکہ فعّالی نوعیت کی بنا پر اس چیز کے اہل تھے۔ روایتی اسلام کو سیاسی مصالح اور جدیدیت کے شکار ذرائع ابلاغ نے پس منظر میں دھکیل دیا اور بنیاد پرستی کو اس کے فکری اتھلے پن سے جنم لینے والی نارسائی کھا گئی جس نے اسے حقیقتِ اشیاء تک پہنچنے سے محروم رکھا۔

نئے شعور کی اہم اور امید افزا بات یہ ہے کہ اس میں اپنی فاعلی حیثیت کے امکانات کا احساس ہویدا ہے۔ ملائیشیا سے سوڈان تک عوامی، تہذیبی سطح پر نمو پذیر مظاہر اس پر شاہد ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ نیا شعور علمی دنیا میں بھی اپنے آپ کو اجاگر کر رہا ہے۔ عالمِ اسلام

کے علمی، تحقیقی اور دانش ور حلقے رفتہ رفتہ اس عمومی انفعالیت سے پیچھا چھڑا رہے ہیں جو مختلف اثرات کے باعث ان پر طاری رہی ہے، اور اپنے مسائل و معاملات اغیار سے مستعار لے کر حتی المقدور اس کے جارحانہ یا معذرت خواہانہ جواب تلاش کرنے کے بجائے خود اپنی علمی اقدار اور مسائل کا تعین کرنے کی راہ پر گامزن ہیں۔ یہی امنگ ہے جو لمحۂ حاضر اور مسائلِ موجود کو آدرش سے ملا دیتی ہے۔

علمی اور تہذیبی دائروں میں جو شعور ملکی اور بین الاقوامی سطح پر ابھر رہا ہے، اسی کا پرتو اقبالیات کے عالم ضمیر پر بھی پڑ رہا ہے۔ اب اقبالیات بھی مستعار اقدار اور مانگے تانگے کے مسائل سامنے رکھ کر فکرِ اقبال میں سے ان کا معذرت خواہانہ جواب ڈھونڈنے یا نیم فخریہ تقابل کرنے کے انفعالی رویے سے باہر نکلتی نظر آتی ہے۔ دوسرے شعبہ ہائے علم کی طرح اس میں بھی اپنی راہ خود نکالنے اور اپنے مسائل خود متعین کرنے کی آرزو جنم لے رہی ہے، اور ماضی میں اس کے فکری رویوں پر نظر کرتے ہوئے یہ تبدیلی نہایت خوش آئند اور مستقبل میں روشن امکانات کی امین کہی جا سکتی ہے۔

ہمیں احساس ہے کہ قطرے اور گہر کے درمیان ابھی بہت کچھ حائل ہے۔ پختہ اور جمے ہوئے فکری رویے اور تحقیق کے نام پر جاری ذہنی کاہلی جاتے جاتے جائے گی۔ آرزو اور آدرش کے بیچ پڑنے والی اوگھٹ گھاٹیوں سے گزر کر ہی یہ نیا شعور خود کو اقبالیات میں ظاہر کر سکے گا۔ مثلاً ادھر کچھ عرصے سے اجتہاد کے مسئلے پر علامہ اقبال کے حوالے سے جو زوروں کی بحث چلی ہوئی ہے، اس میں اس شعور سے پھوٹنے والا دفورِ آرزو اگرچہ بخوبی جھلکتا ہے مگر مناظرے کی فضا کی وجہ سے یہ بحث اپنے مقصود کی راہ سے ہٹ گئی ہے۔ حامی اور معارض، دونوں ہی خوب زور شور سے حسبِ استعداد مجتہدانہ اور غیر مجتہدانہ آرا تو پیش کر رہے ہیں مگر اس مباحثے میں مسئلے کے وہ اہم اور بنیادی پہلو نظر انداز ہوتے جا رہے ہیں جن سے صرفِ نظر کرنے سے نہ صرف مسئلے کی تفہیم ناقص رہ جائے گی بلکہ بار دگر انفعالیت میں پڑنے کے کارن اس شعور کے تقاضے بھی پورے نہ ہو سکیں گے۔

موافق اور مخالف، دونوں فریق اپنی تحسین و تردید کی عمارت "تشکیل جدید" پر اٹھا رہے ہیں۔ یہی چیز ان کو فکری دوراہے پر لا کھڑا کرتی ہے جہاں ان کے لیے چند بنیادی اور ناگزیر سوالات سے نگاہیں چار کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔ اگر وہ اس کی ہمت کر سکیں تو اس نتے

شعور کا دَران پر کھل سکے گا۔ بصورتِ دیگر "تشکیل جدید" کے سطحی مطالعے نیز جزوی اقتباسات پر مبنی قیاسات، غیر مدلل مدّاحی اور خوش / غلط فہمیوں کی پامال رہ گزر تو ان کی تگ و تاز کے لیے پہلے سے موجود ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ "تشکیل جدید" کی حد تک اس نئے شعور کے تقاضے ہنوز پورے نہیں ہو سکے۔ مذکورہ بالا مباحث سے قطع نظر کر کے دیکھیے تو بھی "تشکیل جدید" سے متعلق مطالعات جرح و نقد اور مباحث کی حیرت ناک کمی نظر آتی ہے۔ پھر جو کچھ ہوا بھی ہے، اس کا بیشتر حصہ اسی رویّے کے ذیل میں آتا ہے جسے ہم نے "تشکیل جدید" کا سطحی مطالعہ قرار دیا۔ ہمارے لیے اس مختصر تحریر میں یہ ممکن نہیں کہ اس موضوع پر مفصل محاکمہ یا جائزہ پیش کر سکیں، تاہم ان بنیادی سوالات کی طرف اشارے کرنے کی کوشش کی جائے گی جن کا جواب تلاش کیے بغیر علامہ کے فکر و فن کے مکمل تناظر میں نہ تو خطبات کی حیثیت اور مقام کا تعین ہو سکتا ہے نہ شاعری سے ان کے ربط و تعلق کی کلید میسر آ سکتی ہے، اور نہ ان سے بامعنی اور مفید رہنمائی حاصل ہو سکتی ہے۔

پہلا سوال جو اقبالیات کو اپنے آپ سے پوچھنا ہے، یہ ہوگا کہ اصل چیز اقبال کا شعر ہے یا خطبات۔ شاعری کو اوّلیت حاصل ہے یا خطبات کو؟ اور کیا خطبات ہمارے ادبی اور فکری سرمائے میں اسی جگہ کے مستحق ہیں جو شاعری کو حاصل ہے؟ اس بڑے سوال کے ساتھ ضمنی سوالات کی بیخ بھی لگی ہوتی ہے کہ خطبات کے مخاطب کون تھے۔ اس کے موضوعات چونکہ متعین اور تحریر فرمائشی تھی نیز وسائل مطالعہ و تحقیق ۱۹۲۰ - ۱۹۲۸ تک محدود تھے، لہٰذا شاعری کے آزاد، پائدار اور تخلیقی وسیلے کے مقابلے میں خطبات زمانے کے فکری اور سیاسی تقاضوں، معاشرتی عوامل، رجحانات، نفسیاتی ردِّ عمل اور دیگر محرکات کے زیادہ اسیر ہیں!

شاعری اور خطبات کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ بموارد اختلاف میں شاعری یا تو خطبات کی تابع ہوگی یا تکمیلی حیثیت رکھے گی یا متوازی چلے گی یا خطبات کے بعد کی شاعری خطبات کی ناسخ قرار پائے گی! یہ وہ سوال ہے جس سے بہت کم تعرّض کیا گیا ہے اور اس کے پیچھے رجالِ اقبالیات کی وہ ثنویت کارفرما ہے جس کے تحت شاعری سے شغف اور اشتغال رکھنے والے عموماً خطبات سے اعتنا نہیں کرتے، اور خطبات کو موضوعِ تحقیق بنانے والے شاعری سے سروکار نہیں رکھتے۔ اس میں سخن گسترانہ بات یہ ہے کہ جو محققین خطبات کو اپنا موضوع

بناتے ہیں، ان کی اکثریت شاعری پڑھنے اور سمجھنے سے طبعاً یا فنی اسباب کی بنا پر معذور ہے، اور اس معذوری پر پردہ ڈالنے کے لیے شاعری کو مختلف حیلوں اور دلائل سے ثانوی قرار دینے کے لیے کوشاں نظر آتی ہے۔ ان کی عام دلیل یہ ہے کہ خطبات سوچے سمجھے، بچے تلے اور غیر جذباتی نثری اظہار کا نمونہ ہیں اور شاعری اس کے برعکس یا بہرحال اس سے کم تر۔ یہ لوگ وہ ہیں جو شاعری پڑھنے یا سمجھنے کے اہل ہی نہیں، جو سوچ سمجھ کر صرف مقالہ نگاری کر سکتے ہیں اور جن کے نزدیک دیگر ہر عقلی و ذہنی سرگرمی بے سوچے سمجھے کی چیز ہے۔ ان میں سے جن کو فلسفہ بگھارنے کا زیادہ شوق ہے، وہ شاعری کو لاشعوری محرکات، اجتماعی لاشعور کی برکات، آرکی ٹائپ کا اظہار اور ایسی ہی دیگر انٹ شنٹ چیزوں سے عبارت جانتے ہیں۔ اس طبقے کا رویہ اجمالاً یہ ہے کہ شاعری کی حیثیت نہ تو حکم کی ہے نہ تابع کی اور نہ ہی ناسخ خطبات کی، بلکہ اسے ایک متوازی حیثیت حاصل ہے۔ متوازی خطوط آپس میں ملا نہیں کرتے، لہٰذا اس رویے کا حتمی نتیجہ شعر فراموشی ہی ہو سکتا ہے، اور یہی ہوا بھی ہے یہاں ایک ضمنی سوال سر اٹھاتا ہے کہ اگر اقبال صرف شاعری کرتے اور خطبات نہ لکھتے تو ان کا مقام کیا ہوتا۔ مندرجہ بالا فکری رویے میں پوشیدہ منطق اس کا سامنا کرتے ہی سکڑنے لگتی ہے اور معاملہ ابہام کا شکار ہو جاتا ہے مگر اس سے شاعری اور خطبات کے تعلق کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ خطبات کے بعد علامہ تگ بھگ دس برس زندہ رہے اور مابعد کی شاعری اور دیگر نثری تحریروں میں انھی موضوعات پر اظہارِ خیال کرتے رہے جو خطبات سے متعلق تھے، لہٰذا خطوط اور مابعد خطبات کی شاعری کا تعلق خطبات سے طے کیے بغیر ہم علامہ کے پورے فکری تناظر میں خطبات کی حیثیت کا تعین نہیں کر سکتے۔ اسی بات پر ایک اور پہلو سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ علامہ کا فکری ارتقا یا مختلف مسائل کے مقابل ان کا موقف کہاں ظاہر ہوا ہے، شاعری میں یا خطبات میں؟ بالفاظ دیگر ان کی شخصیت اور فکر کا ارتقا یاب میڈیم کون سا ہے؟ کیا وہی زیادہ قابلِ اعتبار ہوگا؟

علامہ کی نثر اور شاعری کو صرف تاریخی ترتیب سے بھی دیکھیے تو یوں لگتا ہے جیسے ان میں باہم سوال و جواب کے ادوار کا تعلق ہے۔ نثر میں سوال قائم ہوتے ہیں، تجزیہ ہوتا ہے اور شاعری جواب دیتی ہے۔ کیا خطبات اور مابعد کی شاعری میں ایسا ہی تعلق ہے؟

یہاں پہنچ کر ہم ایک اہم اور بنیادی سوال سے دوچار ہوتے ہیں۔ خطبات علامہ کے حتمی نتائجِ فکر ہیں یا ان سوالات اور فکری مسائل کا منظر نامہ جو اس وقت عالمِ اسلام کو درپیش تھے؟ اگر

یہ سوالات تھے تو ہمارا مندرجہ بالا مقدمہ درست ٹھہرتا ہے، اور اگر یہ حتمی جوابات تھے تو کیا آج بھی یہ جوابات وہی استناد رکھتے ہیں جو اس وقت انہیں حاصل تھا یا مابعد کے ارتقائے فکر کی روشنی میں ان کی حتمی حیثیت برقرار نہیں رہی؟ اقبال نے خود ہمیں اس کی کلید خطبات کی ابتدا میں یہ کہہ کر فراہم کر دی ہے کہ فلسفیانہ فکر میں خاتمی چیز کوئی نہیں ہوا کرتی۔ اس سے شخصی افکار مراد لیے جائیں یا فلسفے کے عمومی مناہج کی جانب اشارہ سمجھا جائے، دونوں اقالیم میں حتمیت کی نفی ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ خطبات کی تحریر کے وقت مسائل واقعی صورتِ حال سے پیدا ہو رہے تھے اور جوابات قیاسی تھے۔ بعد کے زمانے میں مسائل کے حل کے لیے جو نیا مواد سامنے آیا، جو تازہ وسائل تحقیق میسر آئے اور علم و فلسفہ میں جتنی پیش رفت ہوئی، اس نے بہت سے قیاسات میں تبدیلی پیدا کر دی جیسے آزاد مسلم مملکت اس وقت ایک خیال تھا، آج امرِ واقعہ ہے۔ اسی ایک فرق سے خطبات میں پیش کردہ ان تجاویز اور افکار کی حیثیت میں تغیر واقع ہونا بدیہی ہے۔ بقول شخصے اگر کلامِ اقبال میں "نیا شوالہ" موجود ہے تو کیا خطباتِ اقبال میں بھی "نئے شوالے" موجود نہیں ہیں؟

اگلا سوال یہ ہے کہ اگر خطبات اور شاعری میں نقطۂ نظر کا کوئی فرق ہے تو یہ دولختِ شخصیت کا شاخسانہ نہیں ہو سکتا کیونکہ اس سے بڑی شاعری تو کجا شاعری ہی پایۂ اعتبار سے ساقط ہو جاتی ہے۔ تو پھر کیا یہ فرق شخصیت کی دو سطحوں اور وجود کے قطبین کا غماز ہے جن میں سے ایک فاعل اور مؤثر ہے اور دوسرا انفعالی اور تاثر پذیر؟ ایک افقی ہے، اسیرِ تاریخ ہے، اس سے متاثر ہوتا ہے اور سوال کرتا ہے۔ دوسرا عمودی ہے، تاریخ سے ورا دیکھتا ہے، جواب دیتا ہے اور آرزو کے سہارے آدرش تک رسائی چاہتا ہے۔ شاعری فاعل جہت کا ظہور ہے اور خطبات انفعالی سطح کی تجسیم!

خطبات میں بعض مسائل کے ضمن میں علامہ نے مغربی تہذیب یا فکرِ مغرب کو اسلامی تہذیب اور افکار سے ہم آہنگ دکھانے کی بات کی ہے مثلاً فرضیۂ ارتقا، حرکت کا تصور اور جدید سائنس (جواب متروک اور کہنہ سائنس ہو چکی ہے) وغیرہ تو اس میں کیا مصلحت تھی؟ ایک طرف ہندو اکثریت تھی جو سیاسی غلبہ حاصل کرنے پر تلی ہوئی تھی اور دوسری جانب انگریز تھے جو جدید سائنسی ترقی اور ٹیکنالوجی کے سہارے مادی غلبہ حاصل کیے ہوئے تھے۔ کیا اقبال خطبات میں ایسے خطوطِ عمل وضع کرنا چاہتے تھے جن کے سہارے ان دونوں کو کسی ایسی جہت میں لے آیا جائے جہاں وہ اسلام کی فکر کا ہدف بن سکیں اور ان کی فلسفیانہ مقاومت سے

مسلمانوں کی شکست خوردہ کیفیت کا مداوا ہو سکے!

آخری بات: خطباتِ اقبال اصولِ دین کی تشکیلِ نو سے عبارت ہیں یا انہیں عقلِ جزوی سے پھوٹنے والی اس ثانوی فکری سرگرمی کے ذیل میں رکھا جانا چاہیے جو مرورِ زمان اور انسان کے متغیرّ ذہنی تقاضوں کے جواب میں اُبھرتی ہے؟ اشیاء کی مابعد الطبیعیاتی حقیقت اور حقائقِ دین غیر متغیرّ چیزیں ہیں اور نفوسِ انسانیہ اور زمانے کی رَو امورِ متغیرّہ۔ پس دین کے ابدی اور غیر متغیرّ حقائق کے زمانی اطلاق اور زمانے کی رو میں بہتے ہوتے بدلتی کیفیات کے اسیر نفوسِ انسانیہ تک ان کے ابلاغ کے لیے ایک پل یا واسطہ فراہم کرنا اس فکری سرگرمی کا فریضہ ہے۔ یہ حقیقتِ اشیاء ہی کا ایک پہلو ہے اور اس اعتبار سے اپنا جواز رکھتی ہے۔ مگر پل ڈالنے کا یہ عمل زمانی و مکانی ہے، وقت کے تقاضوں کا اسیر ہے، وسائل کا محتاج ہے اور اپنے عناصرِ ترکیبی سے تاثر پذیر ہوتا ہے، لہٰذا آج اگر ایک پل تعمیر ہوتا ہے تو کل بہتر وسائل، مختلف تقاضے یا زمان و مکان کے نئے سانچے پیدا ہونے سے لازماً اس پل کی شکل بھی بدل جائے گی اور اس فکری سرگرمی کے نتائج اپنی غرض و غایت میں یکساں ہوتے ہوئے بھی اپنے اسلوبِ اظہار، طریقِ کار اور اہداف میں باہم مختلف ہوں گے۔ اس مقدمے کا ایک اطلاق تو خود علامہ کے اپنے فکری ارتقا اور مابعد خطبات کی شاعری میں اس کے اظہار پر ہوتا ہے۔ اس سے الگ ہو کر بھی دیکھیے تو علامہ کی زندگی میں اور ان کے بعد سے اب تک عالمِ اسلام اور مغرب میں تاریخی، علمی اور فکری تغیرات کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے جو مسائل کو منہدم بھی کرتا ہے اور ان کے نئے حل بھی پیش کرتا ہے۔ گزرے ہوتے ساٹھ سال کے تناظر میں خطبات پر اس پیش رفت کا کیا اثر تسلیم کیا جانا چاہیے؟